انقلابِ ۱۸۵۷ء میں عُلماے اہلِ سُنَّت کا کردار

سَوادِ اعظم اہلِ سُنَّت و جماعت کی مرکزی درسگاہ، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ، یوپی (انڈیا) کی جماعتِ سابعہ کے طلبہ

ہر سال، یومِ مفتیِ اعظمِ ہند (حضرت مولانا الشاہ مصطفیٰ رضا، قادری برکاتی، بریلوی، متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) کے موقع پر ملک کی کسی معروف شخصیت کو مدعو کرتے ہیں اور اس کے خصوصی خطاب سے سبھی طلبہ اور دیگر باذوق و باشعور حضرات، مستفید ہوتے ہیں۔

۲۰۰۷ء میں طلبہ نے حضرت مولانا یٰسٓ اختر مصباحی
بانی وصدر دارُالقلم، ذاکرنگر، نئی دہلی کو، مدعو کیا۔

آپ نے اشرفیہ مبارک پور تشریف لاکر ۲؍فروری ۲۰۰۷ء کی شب میں ''**انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلماے اہلِ سنّت کا کردار**'' کے موضوع پر طلبہ واساتذہ کو خطاب فرمایا۔

اِس موضوع کا انتخاب، طلبہ نے ہی کیا تھا۔

کیسٹ سے نقل کر کے یہ خطاب، حاضرِ خدمت کیا جارہا ہے۔

امید ہے کہ ملک و بیرونِ ملک کے بیدار مغز حلقۂ اہلِ سُنَّت میں اِس خطاب کے مشتملات و نِکات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور اس خطاب کی روح کو سمجھ کر، اس کے مطابق، عُلماے اہلِ سُنَّت، کچھ اِقدام وعمل کی طرف بھی فوری توجہ، مبذول فرمائیں گے۔

محمد شہاب الدین، مصباحی، متعلم درجۂ سابعہ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارکپور

بَعدَ الْحَمْدِ وَ الثَّنَاءِ وَ الصَّلٰوۃِ وَ التَّسلیم۔

اساتذۂ کرام وعزیز طلبہ! میں آپ حضرات کی دعوت پر آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برادرِ مکرّم، حضرت مولانا محمد احمد اعظمی، مصباحی صاحب (صدرالمدرسین الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور) نے، اپنے تعارفی کلمات میں جو کچھ ارشاد فرمایا، اُسے، آپ حضرات نے بغور سنا۔

ایک خاص بات، جو میرے لئے بہت مفید ہے، وہ، یہ ہے کہ:

اپنے خطاب اور طرزِ خطاب سے انھوں نے آپ حضرات کو بتایا اور باور کرادیا کہ:

آنے والے مقرر کی تقریر بھی، میری ہی تقریر کی طرح ہوگی۔

یہ میرے کام کی بات تھی، جسے میں نے بطورِ خاص، توجہ سے سن کر سمجھ کر اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا۔

یہاں پر سامنے، پیکٹ کی شکل میں جو ہدایا و تحائف، نظر آرہے ہیں وہ، غالبًا، کتابوں کے ہیں۔ جو طلبہ، یومِ مفتیِ اعظم کے اِس مبارک موقع پر مقالات ومضامین لکھ کر، اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں، انھیں، یہ تحفے، عطا کیے جائیں گے۔

اساتذہ ومدرسینِ کرام نے آپ حضرات کے ذوق وشوق
اورتحریری دل چسپی کے تعلق سے مجھے بتایا کہ:

اِس سال، تحریری مقابلے میں شریک ہونے والے طلبہ کی مجموعی تعداد، پانچ سو چھہتر (۵۷۶) ہے۔ جن میں سے، پینتالیس (۴۵) طلبہ، بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئے ہیں۔

باقی طلبہ نے بھی محنت سے مقالے لکھنے کی کوشش کی ہے۔

امید ہے کہ آئندہ سال، باقی ماندہ طلبہ، میں جو طلبہ، مضمون نویسی کے مقابلے میں حصہ لیں گے، اُن میں سے، اچھے طلبہ پینتالیس (۴۵) کی تعداد میں شریک ہوجائیں گے۔ اِنْ شاءَ اللّٰہ۔

اگر، میں، تحریر ومقالہ نویسی کے تعلق سے کچھ باتیں، عرض کروں تو شاید، وقت، زیادہ ہوجائے گا اور مجھے جو عنوانِ خطاب، عطا کیا گیا ہے اُس پر، بات، بہت مختصر ہوپائے گی۔ اِس لئے میں آپ حضرات سے گزارش کروں گا کہ:

اپنے اساتذہ سے، اس سلسلہ میں تربیت، حاصل کرتے رہیں۔

ان کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں۔تا کہ آئندہ، آپ بھی ایک اچھے صاحبِ فکر وقلم بن سکیں۔
مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ''انقلاب ۱۸۵۷ء میں عُلما ے اہلِ سُنَّت کا تاریخی کردار''
آپ کا موضوع ہوگا۔اس پر آپ کچھ تاریخی حقائق، پیش کریں
تا کہ ہمارے طلبہ، انہیں، سن کر، جان کر، اصل تاریخ سے واقف ہوں
اوران کے اندر، یہ احساس، یہ جذبہ، یہ بیداری، پیدا ہو کہ:
ہم، صحیح تاریخ، دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ عُلما ے اہلِ سُنَّت نے
قوم کے لئے، ملک ومِلَّت کے لئے، اپنے وطنِ عزیز کے لئے، کتنی عظیم قربانیاں، دی ہیں۔
ایسی عظیم قربانیاں کہ انہیں کے ذریعہ، آج، دینی علمی ادبی تاریخی صحافتی سیاسی تاریخ کا
تسلسل ہے۔اور ہم، اپنے اَبنائے وطن کے سامنے
اپنے اسلاف کی قربانیاں، پیش کرکے، اپنا سر، فخر سے اونچا کر سکتے ہیں۔
عزیز طلبہ! یہ بات، ہمیشہ، ذہن نشیں رکھیں کہ:
آپ کا منصب، آپ کی حیثیت، آنے والے دنوں میں آپ کا مقام اور کام
صرف، یہ نہیں ہے، اور نہ، یہ ہونا چاہیے کہ:
ہم، تاریخ پڑھیں، تاریخ سنیں اور دوسروں کو سنائیں۔
بلکہ، آپ کے اندر، یہ حوصلہ ہونا چاہیے، آپ کا، یہ عزم ہونا چاہیے کہ:
ہم، آنے والی تاریخ، خود اپنے ہاتھوں سے ایسی بنائیں کہ:
بعد کی نسل، ہمارے کارناموں اور ہماری خدمات پر، فخر کر سکے۔
آپ کا منصب ومقام، صرف تاریخ، پڑھنے کا نہیں، بلکہ تاریخ بنانے کا ہے۔
آپ کی حیثیت، حالات کے دھارے میں بہنے کی نہیں ہے۔
بلکہ حالات کا دھارا اور اس کا رُخ موڑنے کی ہے۔
یہ اشرفیہ، مبارک پور اور اس کے فرزندانِ گرامی قدر، یہاں سے نکل کر، ہندوستان کے
مختلف حصوں میں اور ہندوستان سے باہر، جہاں بھی گئے ہیں، انھوں نے، وہاں کے حالات کا
جائزہ لے کر اپنے اِخلاص واَخلاق، اپنی علمی فکری صلاحیت کی بنیاد پر، ایک نئی تاریخ بنائی ہے۔
خواہ، وہ، یوپی و بہار کی سرزمین ہو، خواہ، ساؤتھ افریقہ کی سرزمین ہو، خواہ، نیپال کی سرزمین

ہو، خواہ، کراچی کی سرزمین ہو، خواہ، ہالینڈ کی سرزمین ہو، خواہ، انگلینڈ کی سرزمین ہو، خواہ، امریکہ کی
یا۔آسٹریلیا کی سرزمین ہو۔
ہر جگہ اور ہر طرف، فرزندانِ اشرفیہ کا، مصباحیوں کا
پرچم اور ان کا علم لہراتا ہوا نظر آتا ہے۔
''انقلابِ ۱۸۵۷ء'' ہندوستانی تاریخ کا نہایت خوں چکاں باب ہے۔
تاریخوں میں آپ نے، کچھ ضرور پڑھا ہوگا کہ:
انگریز، ہندوستان کے اندر، شاہانِ مغلیہ کے زمانے میں تاجر کی حیثیت سے آئے۔
لیکن، رفتہ رفتہ، کئی سو سال کی محنت کے بعد، انھوں نے، دلی کے تخت وتاج پر قبضہ کر لیا۔
۱۷۵۷ء میں ''پلاسی'' کی سرزمین پر، نواب سراج الدَّولہ اور انگریزوں کے درمیان
جنگ ہوئی، لیکن، کچھ ہندوستانیوں ہی کی غدَّاری سے نواب، سراجُ الدَّولہ کو
شکست سے دوچار ہونا پڑا۔اور انگریز، پورے بنگال پر قابض ہو گئے۔
اس تاریخ کا، صرف، سیاست اور حکومت سے، ربط و تعلق نہیں ہے
بلکہ مذہب، علم، اخلاق، ساری چیزیں، متأثر ہوئی ہیں، ان سے اور ان جنگوں سے۔
انگریزوں کی حکومت، ان کے قبضے اور ان کے اختیار واقتدار سے بھی
یہ چیزیں، کہیں، متأثر اور کہیں، مغلوب ہوئی ہیں۔
اِس لئے آپ حضرات کو، اس تاریخ سے بھی، باخبر رہنا، نہایت ضروری ہے۔
ہندوستان کے شیر دل حکمراں، سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے
اپنے کچھ زرخرید ہندوستانی حریصوں، ہندوستانی غدَّاروں کی مدد سے ۱۷۹۹ء میں زیر کیا۔
اور میدانِ جنگ میں اپنے قلعہ کے سامنے، سلطان ٹیپو کو انگریزوں نے شہید کیا۔
اور انھیں، جب، یقین ہو گیا کہ سلطان ٹیپو، اِس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے
تو، انگریز کمانڈر نے کہا تھا کہ **''آج سے ہندوستان، ہمارا ہے۔''**
یعنی، آج، صرف، سلطان ٹیپو ہی نے شکست نہیں کھائی ہے۔ بلکہ، ہندوستان نے
شکست کھائی ہے اور ہمیں، دلی پر قبضہ کرنے سے، کوئی، روک نہیں سکتا۔
سلطان ٹیپو، وہی شخص ہے، جس کا، یہ مقولہ آپ حضرات نے، بار ہا سنا ہوگا کہ:

''شیر کی ایک دن کی زندگی، گیڈر کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

یعنی جیو، تو شیر کی طرح جیو، گیڈر جیسی زندگی، نہ گذارو۔

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے، دلی پر مکمل قبضہ کرلیا۔

لیکن، اُس وقت کے شاہِ عالَم کو فاتح انگریزوں نے محض، ایک پنشن یافتہ سلطان کی حیثیت سے باقی رکھنا، اپنے حق میں مفید سمجھا اور شاہِ عالَم کے اختیارات، انگریزوں نے، اتنے محدود کردیے کہ کہا جاتا تھا اور تاریخوں میں، یہ جملہ ملتا ہے کہ ''سلطنتِ شاہِ عالَم از دلی تا پالَم۔''

آج کا پالَم ہوائی اڈہ (نئی دہلی) نہایت مشہور ہے۔

اُس وقت، شاہِ عالَم کی سلطنت و حکومت، سمٹ کر، **دلی سے پالم تک رہ گئی تھی۔**

باقی پورے ہندوستان پر عملاً، انگریز، حاکم ہو گئے۔

یہ قبضہ، یہ تسلسل، جاری رہا، تا آں کہ مئی ۱۸۵۷ء میں بعہد بہادر شاہ ظفر، میرٹھ میں دس مئی کو کچھ ہندوستانی فوجیوں نے بغاوت کی اور اس کے بعد، دہلی سے لکھنؤ تک، زبردست جنگ ہوئی۔

تقریباً، ساڑھے چار مہینے تک، جنگ ہوئی دلی میں، جس میں شکست (۱۹/ستمبر ۱۸۵۷ء) کے بعد **دلی کے تخت و تاج پر، برطانیہ کی مکمل حکومت ہوگئی۔**

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کا نام بھی ختم ہوگیا اور اس کی جگہ پر

براہِ راست، ملکۂ برطانیہ کی حکومت، قائم ہوگئی۔

۱۸۵۷ء کی تاریخ کا خلاصہ، یہ ہے اور یہی، درحقیقت، ملکی و عوامی جنگِ آزادی کی صحیح تاریخ ہے۔

اور بہادر شاہ ظفر، ایسے سنّی حنفی حکمراں اور خوش عقیدہ مسلمان تھے کہ میلاد و قیام وغیرہ کے تعلق سے، حضرت علاّمہ فضلِ رسول، عثمانی، بدایونی سے، باضابطہ، انھوں نے اِستفتا کیا تھا اور علاّمہ فضلِ رسول، بدایونی نے، اس اِستفتا کا جواب دیا۔

جس کی طباعت و اِشاعت، مطبع مفیدُ الخلائق، دہلی سے ۱۲۶۸ھ میں ہوئی۔

اور جو ''**اکملُ التاریخ**''، مطبوعہ بدایوں کی جلدِ دوم کے اندر، موجود ہے۔ مع مکمل سوال و جواب۔

اسی طرح، بہادر شاہ ظفر نے، سلطانُ الہند، حضرت خواجہ معین الدین، چشتی، اجمیری رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کی شان میں ایک بہت ہی شاندار اور بہت ہی ایمان افروز منقبت لکھی ہے۔

وہ منقبت پڑھ کر، سن کر، روح، وَجد میں آ جاتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ:

عہدِ حاضر کا کوئی سنّی شاعر، حضرت خواجہ غریب نواز کی منقبت خوانی کر رہا ہو۔

یا معین الدین چشتی، دست گیری، لازم ست۔

یہ بہادر شاہ ظفر، آخری مغل حکمراں تھے اور بزرگوں سے، یہ بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔

سنّی حنفی حکمراں تھے۔ اَعراسِ بزرگانِ دین میں شرکت، کرتے تھے۔

عُلمائے اہلِ سنّت سے، ان کا رابطہ، قوی تھا۔ یہ ایک پہلو ہوا، حکومت اور اِقتدار کے لحاظ سے۔

عزیز طلبہ! آپ، تاریخ پڑھیے۔ دہلی کے صدرُ الصُّدور، حضرت علاّمہ فضلِ امام خیر آبادی، جو حضرت علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی کے والدِ محترم ہیں۔

جن کی کتاب ''**مرقات**'' کے نام سے، منطق کی مشہور کتاب ہے۔

درس کے اندر آپ پڑھتے ہیں۔

یہ دہلی کے صدرُ الصُّدور تھے اور ان کے بعد، ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے، آپ کے شاگردِ رشید حضرت مفتی صدرُ الدین، آزردہ، دہلوی، صدرُ الصُّدور ہوئے اور ان کی صدارت کی پوری مدت تقریباً، پندرہ سال تک تھی۔ یعنی، پندرہ سال تک، دہلی کے صدرُ الصُّدور رہے۔

(۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۷ء تک، صدر امین و صدرُ الصُّدور دہلی۔ جون ۱۸۴۴ء میں دہلی کے صدرُ الصُّدور بنائے گئے تھے۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء تک اپنے منصب پر، برقرار رہے)

ان کی حیثیت، یہ تھی کہ دلّی کے سارے عُلما، اُدَبا، فُضَلا، شعرَا، اُمَرا

ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے تھے اور ان سے اِستفادہ کرتے تھے۔

اور دہلی کے سارے اصحابِ علم و فضل، براہِ راست، ان سے وابستہ تھے۔

مفتی صدرُ الدین آزردہ اور علاّمہ فضلِ حق، خیر آبادی، یہ دونوں، ہم سبق ساتھی تھے۔

اور علاّمہ فضلِ امام، خیر آبادی کے معقولات میں

اور شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی کے منقولات میں شاگرد تھے۔

مفتی آزردہ کا مسلک جاننے کے لئے، آپ، ان کی مشہور کتاب

''مُنتَهَى الْمَقال فِي شَرحِ حَدِيثِ لَاتُشَدُّ الرِّحَال'' مطالعہ کریں۔

یہ آپ کی کتاب ہے، جو آپ نے عربی و فارسی میں لکھی ہے۔

اور تقریباً، بیس (۲۰) سال پہلے، اس کا ترجمہ، لاہور سے اردو میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ کتاب، میں نے خود پڑھی ہے، جس کے شروع میں، تمہید میں، آپ لکھتے ہیں کہ:

اِس وقت، ایک جماعت، پیدا ہوگئی ہے، جو ائمۂ مجتہدین پر، طَعن و تشنیع کرتی ہے اور اولیاے امّت کے خلاف، انگشت نمائی کرتی ہے۔

اس سے، سیدھا سیدھا اشارہ آپ کا، فرقۂ وہابیہ کی طرف ہے۔

اور جو مباحث ہیں، ان مباحث کے اندر، آپ نے، واضح طور پر ''ابنِ حَزم ظاہری'' اور ''ابنِ تیمیہ حَرّانی'' کا نام لے کر، ان کی تنقید و مذمّت کی ہے۔ ان کے مسلک کی مذمّت کی ہے۔

اِس مُنتہیٰ المَقال پر، حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی و حضرت مفتی محمد سعدُ اللہ، مرادآبادی کی تحریری تصدیق (بزبانِ عربی) بھی، مطبوع و موجود ہے۔

''**اِمتناعِ نظیرِ محمدی**'' کے موضوع پر بھی، مفتی آزردہ کی ایک تحقیقی کتاب کا مخطوطہ حکیم محمود احمد، برکاتی، ٹونکی (کراچی) کے ذاتی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

یہ حضرت آزردہ، بڑے جلیلُ القدر اور عظیم عالم و فاضل تھے۔ اور ان کا ذاتی کتب خانہ اُس زمانہ میں اتنا زبردست تھا کہ تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) روپے کی کتابیں، اپنی ذاتی آمدنی سے انھوں نے، جمع کی تھیں۔ **جنھیں ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں انگریزوں نے، برباد کر دیا۔**

پھر، آپ نے، جولائی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف، فتواے جہاد پر، دستخط کیا تھا۔

اس کی پاداش میں آپ کی ساری جائداد، ضبط ہوگئی۔

بعد میں مقدمہ چلا۔ آپ، لاہور چلے گئے پھر واپس، دہلی آئے۔

اور جتنی جائداد، غیر منقولہ تھی، وہ سب کی سب، ضبط ہوگئی۔ کچھ تھوڑی سی، واپس ملی۔

سیاسی حکومت و اِقتدار کے لحاظ سے، اُس وقت، جو مرکز تھا، وہ بھی، سُنّی حنفی تھا۔

اور اس زمانے کا، جو صدرُ الصُّدور تھا، وہ، بھی، سُنّی حنفی تھا۔

حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ، اُس وقت کے عُلما کے مرجع تھے۔ دہلی سے آگرہ و اَوَدھ تک کے عُلما، حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ کو، نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

طبقۂ عُلما میں جنگی لحاظ سے انقلابِ ۱۸۵۷ء میں سب سے زیادہ

جس نے دادِ شجاعت دی، اس کا نام ہے: مولانا سید احمدُ اللہ شاہ، مدراسی۔

سلطان ٹیپو کی فوج میں، ان کے والد، بہت بڑے عہدیدار اور اپنے علاقہ کے نواب تھے۔

آپ، ان کے صاحبزادہ ہیں۔ اور میر قربان علی شاہ، جے پوری، ایک بزرگ تھے، ان سے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت ہیں۔ پھر، ان کے بعد، یہ طالب ہوئے، محراب علی شاہ قلندر گوالیاری سے **سلسلۂ قادریہ میں۔ جنھوں نے، روحانی بیعت کے ساتھ، یہ بھی بیعت لی کہ:**

انگریزوں کے خلاف، تم جہاد کرنا اور انھیں اِس ملک سے نکال باہر کر دینا۔

مولانا احمدُ اللہ شاہ، مدراسی، ۱۸۴۶ء میں دلی آئے۔

اور استخلاصِ وطن کی مُہم کی ماحول سازی اور کامیابی کے لئے

مفتی صدرالدین آزردہ سے ملاقات کی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ:

اِس کام کے لئے، سب سے بہتر جگہ، آگرہ ہے۔

اس زمانے میں، ممالکِ متحدہ، اَوَدھ و آگرہ کے نام سے، آج کے پورے صوبہ یو۔ پی کا یہ علاقہ، جانا جاتا تھا۔ آگرہ، صدر مقام تھا، جیسے لکھنؤ، اِس وقت، صدر مقام ہے۔

مفتی صدرُالدین، آزردہ نے، مولانا احمدُ اللہ شاہ مدراسی کو آگرہ بھیجا اور صرف بھیجا ہی نہیں بلکہ تعارفی مکتوب بھی لکھا مولانا انعام اللہ گوپامئوی کے نام۔ جس میں کچھ اِس طرح تحریر فرمایا کہ:

مولانا مدراسی کی جتنی مدد ہوسکے، آپ لوگ، مدد کریں۔''

آگرہ میں مولانا احمدُ اللہ شاہ مدراسی نے بہت جَم کر کام کیا۔

دینی و تبلیغی کام بھی کیا اور جہاد کے لئے بھی لوگوں کو آمادہ کیا۔

اور اس زمانے میں آگرہ، چوں کہ مرکز تھا، اِس لئے، بہت بڑے بڑے عُلما وہاں پر جمع تھے۔ بہت بڑے بڑے شُعَرا، وہاں پر جمع تھے۔

حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی بھی وہاں پر تھے۔ حضرت غلام امام شہید، جو بہت مشہور عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر ہیں، وہ بھی تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی، مولانا سید محمد قاسم، داناپوری، اِس طرح کے بہت سارے عُلما تھے۔ ان سب کو آپ نے آمادۂ جہاد کیا **اور ''مجلسِ عُلما'' قائم کر کے، اس کے ذریعہ، حُریت پسند حضرات کو منظم کیا۔**

ایک بہت بڑا واقعہ، اُس زمانے میں یہ ہوا کہ:

۱۸۵۴ء میں، پادری فنڈر اور عُلماے اہلِ سنّت کے درمیان، مناظرہ ہوا۔ مولانا رحمتُ اللہ کیرانوای، مناظرِ اوّل تھے۔ مولانا ڈاکٹر وزیر خاں، اکبرآبادی اور حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی

بدایونی، یہ حضرات، معاون مناظر تھے۔

آپ حضرات، ان سارے عُلما کی تاریخ پڑھیں گے، تو معلوم ہوگا کہ:

یہ سارے کے سارے عُلما، خالص سُنّی حنفی تھے۔ اور حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی
توعلاّمہ فضلِ رسول بدایونی کے بھانجے ہیں۔ اور بھانجہ ہونے کے ساتھ ساتھ
آپ اپنے نانا سے سلسلۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں باضابطہ بیعت بھی ہیں۔
اور ان کے نانا (حضرت مولانا شاہ عینُ الحق عبدالمجید، عثمانی بدایونی) حضرت سید شاہ
آلِ احمد، اچھے میاں، قادری، برکاتی، مارہروی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کے، **چہیتے مرید و خلیفہ تھے۔**

اس وقت، آگرہ کے، جو بھی ممتاز عُلما تھے، ان میں سے اکثر حضرات
۱۸۵۴ء میں آگرہ کے اندر، جمع تھے۔
پھر، مئی ۱۸۵۷ء میں، جب، دہلی کے اندر، جنگ، شروع ہوئی، جنگ پھیلی

تو پوری مذہبی قیادت، ان عُلمائے کرام نے کی اور جہاد کی روح پھونکنے کی ذِمَّہ داری
ان سبھی حضرات نے، انجام دی، جن میں سے حضرت مولانا فیض احمد، عثمانی، بدایونی کے بارے میں
آپ، جان چکے ہیں۔

دلی کے اندر، ساڑھے چار ماہ کی جنگ ہوئی۔

جس میں جنرل بخت خان، روہیلہ اور علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی، وغیرہ نے
قائدانہ کردار ادا کیا۔

عزیز طلبہ! اب، آپ، یہاں پر، توجہ فرمائیں کہ:
۱۸۵۷ء کی پوری جنگ، جو لڑی گئی، وہ، دلی میں لڑی گئی۔

اس کے بعد ”روہیل کھنڈ“ (بریلی و پیلی بھیت و مرادآباد و بدایوں و شاہجہاں پور و بجنور
وغیرہ) میں، لڑی گئی۔ الٰہ آباد و کان پور و لکھنؤ میں لڑی گئی۔

دلی کا پورا محاذ، دلی کے سُنّی عُلما اور سپہ سالاروں نے سنبھالا اور ساری کمان، ان کے ہاتھ میں
تھی۔ بریلی میں، خان بہادر خاں کی قیادت میں انگریزوں سے جنگ لڑی گئی۔

جو، حافظ رحمت خاں، روہیلہ (شہید و مدفون بریلی) کے پوتا تھے۔

اور حافظ رحمت خاں روہیلہ، صرف ایک سپہ سالار نہیں تھے، سُنّی حنفی مجاہد اور متبعِ شریعت بھی تھے۔

مجھے، اچھی طرح یاد ہے کہ حافظ مِلّت عَلَیْہِ الرَّحْمَۃُ وَ الرِّضْوَان (حضرت مولانا الشاہ
عبدالعزیز، مرادابادی، محدّث مبارک پوری، بانیِ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور اعظم گڑھ، یوپی)
جب طلبہ کو خطاب کرتے تھے۔ نماز کی پابندی کی نصیحت فرماتے تھے
تو، حافظ رحمت خاں، روہیلہ کا خصوصیت سے، ذکر فرماتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ:

عین حالتِ جنگ میں بھی، حافظ رحمت خاں روہیلہ، جماعت کے ساتھ، نماز پڑھتے تھے۔

ان کے یہ پوتے تھے: خان بہادر خاں، روہیلہ۔

اور ان کے معاون مفتی تھے، حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی۔

جن کی ”تواریخِ حبیبِ الٰہ“ ”علم الصیغہ“ وغیرہ، آپ حضرات نے پڑھی ہوگی۔

علم الصیغہ، داخلِ درس ہے، اِس لئے آپ میں سے اکثر حضرات نے، یہ کتاب پڑھی ہوگی۔

انگریزوں نے، ایک فتویٰ پر، آپ کے دستخط کی بنیاد پر
جرمِ بغاوت میں آپ کو ”کالا پانی“ کی سزا دی تھی۔

پھر، شہزادہ فیروز شاہ، بریلی کے اندر تھا۔ جب، حج سے واپس آیا۔

اور انوکھی بات، یہ ہے کہ تمام سلاطینِ مغلیہ اور ان کے شہزادوں میں
صرف، شہزادہ، فیروز شاہ ایسا تھا، جس نے حج کیا تھا۔ اس سے پہلے، یا اس کے بعد
کسی بھی معروف مغل شہزادہ نے، حج نہیں کیا۔

اُس دَور کا شہزادہ، فیروز شاہ، مالوہ، اندور، آگرہ، متھرا، دھولپور، ہوتا ہوا، دلی پہنچا۔

اس کے بعد، بریلی میں، اس نے پڑاؤ ڈالا۔

روہیل کھنڈ کا، یہ علاقہ، جو اِس وقت ہے، اس میں بریلی، شامل ہے۔ مرادآباد، شامل ہے۔
بدایوں، شامل ہے۔ شاہجہاں پور، شامل ہے۔

روہیلہ پٹھانوں کی اُس زمانے میں آبادی، یہاں، زیادہ تھی۔
اِس لئے اِس پورے علاقہ کو، روہیل کھنڈ کہا جاتا ہے۔

آج بھی، اس علاقہ میں، سنّیوں کی غالب اکثریت ہے۔

۱۸۵۷ء میں، تو شاید باید، کوئی وہابی، اس علاقہ میں مشکل سے ملتا ہوگا۔

پیلی بھیت، مرکز تھا، جہاں کی جامع مسجد، حافظ رحمت خاں، روہیلہ کی بنوائی ہوئی ہے۔

اورآپ حضرات نے، تاریخ میں یہ بھی پڑھا ہوگا کہ:

فقیہِ اسلام، امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی بھی، افغانی تھے۔

بھڑیچ خاں قبیلہ سے، ان کا تعلق تھا اور، اوپر جا کر، روہیلہ سے، اس کا رشتہ مل جاتا ہے۔

اور ''مسجد بی بی جی''، بہاری پور جو بریلی شریف کے اندر ہے۔

جہاں، اِس وقت، مفتیِ اعظم ہند (مولانا الشاہ محمد مصطفیٰ رضا، قادری، برکاتی، بریلوی متوفی ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۱ء) **کا دارُ العلوم مظہرِ اسلام، قائم ہے۔**

امام احمد رضا، قادری برکاتی، بریلوی نے، جب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں منظرِ اسلام، قایم کیا تو پہلے، باضابطہ مدرسہ کی شکل میں تعلیم، اسی مسجد بی بی جی، بہاری پور (بریلی) میں شروع ہوئی۔

یہ مسجد بھی، حافظ رحمت خاں، روہیلہ کے گھر کی کسی نیک خاتون کے نام سے، موسوم ہے۔

انھوں نے، اس کی تعمیر کرائی تھی اور ابھی تک اس کا نام ''مسجد بی بی جی'' ہی ہے۔

یہ، جو روہیل کھنڈ کا علاقہ تھا، سب سے زبردست اور خون ریز جنگ، اسی علاقہ میں ہوئی تھی اور یہاں، جتنے بھی عُلما تھے، سب کے سب، سنّی عُلمائے کرام تھے۔

جن کی کمان میں جنگِ آزادی لڑی گئی۔ حضرت مفتی عنایت احمد، کاکوروی و حضرت مولانا رضا علی، بریلوی کی سرپرستی و پشت پناہی، بریلی کے مجاہدین کو حاصل تھی۔

امام احمد رضا، قادری، برکاتی، بریلوی کے حقیقی دادا، مولانا رضا علی، بریلوی
فنِ شاعری میں، حضرت مفتی صدرُالدین، آزردہ، دہلوی کے شاگرد تھے۔

مولانا رضا علی، بریلوی کے ایک چہیتے اور بہادر شاگرد، مولانا فخر الدین، جو سندیلہ، ہردوئی (اَوَدھ) کے باشندے تھے، وہ، انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے، بریلی میں۔

درجنوں گھوڑے، مولانا رضا علی بریلوی کے، انگریزوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے لئے، وقف تھے۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی سے ۱۸۵۵ء مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی نے
لکھنؤ میں ملاقات کی۔ باضابطہ، تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جنرل بخت خاں نے
دہلی میں آپ سے ملاقات کی۔ بہادر شاہ ظفر سے لال قلعہ میں مشورے ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ، دِلی سے لکھنؤ تک لڑی گئی۔

اوراس جنگ کی قیادت، عُلمائے اہلِ سنّت نے کی۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی کے بارے میں آپ حضرات نے پڑھا بھی ہوگا، عُلما کی زبانی سنا بھی ہوگا۔ آپ کی مشہور کتاب ''تَحقِیقُ الفَتویٰ فِی اِبطَالِ الطَّغوٰی'' ہے۔

اس کے علاوہ، داستانِ انقلاب پر مشتمل ایک منظوم عربی رسالہ ''الثَّورۃُ الھِندِیَّۃ'' ہے جس کا اردو ترجمہ، بقلم مولانا عبد الشاہد، شیروانی، علی گرھی ''باغی ہندوستان'' کے نام سے بجنور ولاہور اور المجمع الاسلامی، مبارک پور سے شائع ہوا ہے۔

''اِمتِنَاعُ النَّظِیر'' بھی، علاّمہ کی ایک بے نظیر کتاب ہے۔

ان کتابوں سے، ان کا مذہب و مسلک اور ان کی عظمت وفضیلت
دودو چار کی طرح، واضح ہے۔

علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی نے، جامع مسجد، دہلی میں
انگریزی اِقتدار کے خلاف، ۱۸۵۷ء میں تقریر کی اور جہاد کا فتویٰ دیا۔
جس کے نتیجے میں، دہلی کے اندر، نوے ہزار فوجی اور مجاہدین، جمع ہو گئے۔

حضرت مولانا سید کفایت علی، کافؔی، مرادآبادی، رَحمَۃُ اللّٰہِ عَلَیہِ
جلیل القدر عالم و عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ، بہت بڑے قائد و مجاہد تھے۔

مرادآباد میں، مجاہدین کی آپ نے قیادت کی۔

اور ۱۸۵۸ء میں گرفتاری و نمائشی مقدمہ کے بعد، آپ کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

یہ اتنے بڑے عاشقِ رسول اور نعت گو شاعر تھے کہ:

تختۂ دار کی طرف آپ جس وقت جا رہے تھے، اُس وقت بھی آپ کے لبوں پر ترانۂ نعت، جاری تھا۔ اور یہ اشعارِ نعت گنگناتے ہوئے، تختۂ دار پر چڑھ گئے:

کوئی گل باقی رہے گا، نَے چمن رہ جائے گا
پر رسول اللہ کا، دینِ حَسَن رہ جائے گا
ہم صفیرو! باغ میں ہے، کوئی دَم کا چہچہا
بلبلیں اُڑ جائیں گی، سونا چمن رہ جائے گا
اَطلس و کمخواب کی پوشاک پر نازاں نہ ہو

اِس تنِ بے جان پر، خاک کی کفن رہ جائے گا
جو پڑھے گا صاحبِ لولاک کے اوپر درود
آگ سے محفوظ اُس کا، تن بدن رہ جائے گا
سب فنا ہوجائیں گے کافؔی و لیکن حشر تک
نعتِ حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائے گا

مولانا سید کفایت علی، کافؔی مرادآبادی، اتنے بڑے عاشقِ رسول تھے، اتنے بڑے شاعرِ نعت تھے کہ تختۂ دار پر جاتے ہوئے بھی، نعتِ رسول، گنگنا رہے تھے۔

تو، یہ پوری تاریخ، اہلِ سُنّت وعُلمائے اہلِ سنّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔

صرف ۱۸۵۷ء کی نہیں، بلکہ اس سے پہلے کی اور اس کے بعد کی بھی۔

اگر میں، یہ تاریخ، بیان کروں، تو پوری رات گذر جائے گی۔

لیکن، میں نے، صرف چند پہلوؤں کی طرف، نشان دہی کی ہے۔

آپ حضرات اور ہم سب کی ذِمّہ داری ہے کہ:

صحیح تاریخ، دنیا کے سامنے پیش کریں اور بتائیں کہ:

ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت، ہم نے کی ہے۔

اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے خون کے قطرات، ہم نے بہائے ہیں۔

میدانِ جنگ میں تیر وسنان کے مقابلے کی

جب بھی ضرورت، پیش آئی ہے، تو ہم نے اپنا سینہ، پیش کیا ہے۔

اگر، کوئی نام نہاد مؤرخ، ہماری خدمات اور قربانیوں کو نظر انداز کرتا ہے۔

تاریخ بدلتا ہے۔ تاریخ کا چہرہ، مَسخ کرتا ہے۔ تو، یہ اس کی بدبختی ہے۔

اور تاریخ کے ساتھ، وہ انصاف، نہیں کر رہا ہے، بلکہ تاریخ کے ساتھ، ظلم کر رہا ہے۔

۱۸۵۷ء کی پوری تاریخ، ہمارے عُلمائے اہلِ سنّت کی قربانیوں سے بھری ہوئی ہے۔

اور دلی سے لے کر، روہیل کھنڈ تک، روہیل کھنڈ سے لے کر لکھنؤ تک، اور اس کے بعد جب انگریز اپنے مکر وفریب کے ذریعہ، اپنی طاقت وقوت کے ذریعہ، مجاہدین پر غالب آگئے اور کچھ ہندوستانیوں کی نااہلی وغداری کی وجہ سے انہیں شکست وناکامی سے دوچار ہونا پڑا

تو اکثر مجاہدین اور عُلمائے کرام، شاہجہاں پور میں جمع ہوئے، اور قصبہ محمدی (شاہجہاں پور) ایک جگہ ہے، وہاں، مولانا سید احمد اللہ شاہ، مدراسی وغیرہ نے، باضابطہ ایک مسلم حکومت، قائم کی۔

مولانا فیض احمد، بدایونی، مولانا وزیر خاں، اکبرآبادی، وغیرہ، اَرکانِ دولت وسلطنت منتخب ہوئے۔

لیکن! وہاں بھی، بعض غداروں کی وجہ سے میدان، ہاتھ سے نکل گیا اور اس کے بعد:

شہزادہ فیروز شاہ و جنرل بخت خاں و مولانا فیض احمد عثمانی، بدایونی

اور اِس طرح کے بہت سارے قائدین ومجاہدین، یہاں سے نکل کر، نیپال چلے گئے۔

اور پھر، اس کے بعد، ان میں سے اکثر کے بارے میں، معلوم نہیں ہوسکا کہ:

کب؟ کیسے؟ کہاں؟ ان کا انتقال ہوا؟

البتّہ، مولانا احمد اللہ شاہ، مدراسی ''قصبہ محمدی'' اور اس کے آس پاس کے ایک راجہ، بلدیو سنگھ کے فریب وغدر وبدعہدی کی وجہ سے، جون ۱۸۵۸ء کے معرکۂ محمدی میں ہی شہید ہوگئے تھے۔

مولانا فیض احمد، بدایونی کے بارے میں، میں نے پڑھا ہے۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ:

حضرت علّامہ فضلِ رسول، بدایونی نے، بہت تلاش کیا آپ کو۔ کیوں کہ سگے بھانجے تھے۔

آپ کی تلاش میں، صرف ہندوستان نہیں، بلکہ آپ کی تلاش میں قسطنطنیہ، تُرکی تک، آپ گئے۔

لیکن، آپ کا، کوئی سراغ نہیں ملا۔

اور خدا جانے، کب؟ کیسے؟ کس عالَم میں؟ اور کہاں؟ آپ کا انتقال ہوا؟

عزیز طلبہ! یہ ہندوستانی تاریخ کی خون ریز جنگ (۱۸۵۷ء)

علّامہ فضلِ حق خیرآبادی ومفتی صدرُالدین، آزردؔہ، دہلوی، تلامذۂ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی وحضرت علّامہ فضلِ امام، خیرآبادی کی دینی قیادت میں اور مولانا سید احمدُ اللہ شاہ مدراسی وجنرل بخت خاں وشہزادہ، فیروز شاہ وخان بہادر خاں، روہیلہ کی فوجی کمان میں لڑی گئی۔

اور یہ سب کے سب، سُنّی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔

ہمارا سلسلۂ ذکر وفکر اور سلسلۂ تعلیم، خیرآبادی عُلما سے اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے مذکورہ حضرات کے ذریعہ، ملتا ہے اور یہ حضرات، انہیں سے، وابستہ تھے۔

مفتی صدرُالدین آزردؔہ، دہلوی، حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی اور علّامہ فضلِ امام

خیرآبادی کے شاگرد تھے۔حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی،شاہ عبدالعزیز اوراپنے والد، دونوں
کے شاگرد تھے۔ہم اہلِ سُنّت اور اِس وقت کے، جوعُلمائے کرام ہیں
ان سب کا سلسلۂ تلمذ بھی حدیث کا،حضرت شاہ عبدالعزیز، محدّث دہلوی سے ملتا ہے
اورمعقولات کا،حضرت علاّمہ فضلِ حق خیرآبادی سے ملتا ہے۔
جوآگے چل کر،عُلمائے فرنگی محل لکھنؤ سے مل جاتا ہے۔

تو، یہ سلسلہ، جواُس وقت، جاری ہوا۔دینی، علمی اورروحانی شکل میں
وہ،اب بھی، جاری ہےاورہم،اسی کے وارث اور جانشیں وامین ہیں۔
عزیزطلبہ!تقریباً،دوسوسال کی تاریخ،ایسی لکھی گئی ہے کہ:

عُلمائے اہلِ سنّت کے کردار کوفراموش کرنے، یاداغ دار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اب،ہمارا آپ کافرض ہے کہ اس تاریخ کو، درست کریں۔

سب سے پہلے، تاریخ کوسمجھیں، سمجھائیں، پوچھیں، تحقیق کریں اوراس کے بعد
اس تاریخ کودرست کریں اوردنیا کے سامنے پیش کریں کہ ہم، یہ ہیں اور ہمارا یہ کام ہے۔

اس تاریخ کی شکل، بگڑ جانے کی ایک بڑی وجہ، یہ ہے کہ:
ہمارے عُلمائے اہلِ سُنّت ، چوں کہ نہایت مخلص تھےاوران کا جوبھی کام ہوتا تھا
وہ دین کے لئے،علم کے لئے،اپنی قوم، ملک،اوروطن کے لئے ہوتا تھا۔
جسے، نمایاں کرنا،اس کی نمائش کرنا،عُلمائے اہلِ سُنّت کا،مطمحِ نظر نہیں تھا۔
اس لئے جوکام کیا،کیا،اِس کے بعد بھول گئے۔
عموماً،اسے،ضبطِ تحریر میں لانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔
ان کے برعکس، دیگرعُلما کانظریہ کچھ اِس طرح تھا کہ:

جوکام ہےتھوڑا، بہت ، وہ تو ہے ہی، جوکام اپنانہیں ہے،اسے بھی زیادہ سے زیادہ نمایاں
کیاجائے، **پھر،اس کوبھی اپنے کھاتے میں ڈال کر، دنیا کے سامنے، پیش کیا جائے کہ:**

ہم نے، یہ کارنامہ،انجام دیا۔ہم نے، یہ تیرمارا۔وغیرہ وغیرہ۔
اُس وقت کے عُلمائے اہلِ سُنّت کا اِخلاص،ان کا جذبہ، بخیر تھا۔نیت،صالح تھی۔
اللہ تعالیٰ کے یہاں،اس کا اَجر،انہیں یقیناً، ملے گا، یاملاہوگا۔

لیکن، ہم، چوں کہ ان کے وارث ہیں، جانشین ہیں، اِس لئے آج کے حالات میں
ہماری یہ ذِمّہ داری ہے کہ ہم،اس تاریخ کودنیا کے سامنے، پیش کریں۔
اور یہاں پر، میں اپنے عزیز طلبہ سے یہ کہنا چاہوں گا کہ:
ان میں سے بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہورہا ہوگا۔

اگرچہ، میں نے اِخلاص اور نیک نیتی کے حوالہ سے،اس کا جواب، دے دیا ہے۔کہ:

یہ کمی، کیوں رہ گئی کہ تاریخ، ہم نے صحیح طور پر کیوں نہیں پیش کی؟
تو بجائے اس کے۔ہم میں سے، ہر شخص کو،خود، یہ سوچنا چاہیے کہ:
کیوں رہ گئی،خود، ہم سے تاریخ نویسی؟ کیوں نہ ہوسکی،ہم سے تاریخ نویسی؟
اس پہلو پرغور کریں کہ اب، یہ کمی، نہیں رہنی چاہیے۔

اوراس تاریخ کی یہ کمی، دور کرنا اوراسے درست کرنا، ہماری ذِمّہ داری ہے۔ ہمارا کام
ہے۔ ہمارا فریضہ ہے۔تو یہ احساسِ ذِمّہ داری، ہم اپنے اندر، پیدا کریں۔شعور، بیدار کریں۔

اور جوکمی رہ گئی،اس پر، غیرضروری تنقید وتبصرہ کرنے،نکتہ چینی کرنے کی بجائے
اس کمی کو، دور کرنے کی کوشش کریں۔

اپنے باپ سے،اپنے استاذ سے، یاکسی بڑے سے،اگر کوئی کمی وکوتاہی،نظرآجاتی ہے
تواس کو، بار باراور جگہ جگہ، بیان نہیں کیا جاتا۔اس کی تشہیر نہیں کی جاتی۔
اپنے باپ یابڑے کومورِدالزام نہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کمی کو لائق بیٹا اور لائق بھائی
سعادت مند وارث اور سعادت مند آدمی،اپنی محنت سے دور کرتا ہے۔
اپنے باپ کا،اپنے بھائی کا،اپنے بڑوں کا نام، روشن کرتا ہے۔ **یہی شیوہ، ہمارا ہونا چاہیے۔**
جن عُلمائے کرام کے نام، میں نے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔مثلاً:
حضرت مفتی صدرالدین، آزردہ، دہلوی وحضرت علاّمہ فضلِ حق، خیرآبادی وحضرت مفتی
عنایت احمد، کاکوروی وحضرت مولانا سید کفایت علی، کافی، مرادآبادی، وغیرہ۔
مولانا فیض احمد، بدایونی ومولانا رحمت اللہ، کیرانوی، وغیرہ۔
ان کے حالات، کہیں مختصر، کہیں، معمولی تفصیل کے ساتھ، کتابوں میں ملتے ہیں۔ان کے
حالات کو، ہمیں جاننا چاہیے اوراپنی تقریر،اپنی تحریر کے اندر، ان کا ذکر وبیان کرنا چاہیے۔

عزیز طلبہ! اب، دوسروں کی تاریخ نگاری اور تاریخ کے ساتھ، مذاق کرنے کا یہ انداز ہے۔

یہ طریقہ ہے کہ ایک بزرگ عالمِ دین، جو، اُس زمانے میں مجاہدِ آزادی بھی تھے:

مولانا رحمتُ اللہ کیرانوی، جن کا ذکر ہو چکا ہے۔

۱۸۵۷ء میں، دہلی پر انگریزی قبضہ و اقتدار کے بعد

جب، گرفتاری کا سلسلہ، شروع ہوا تو آپ ۱۸۵۸ء میں مکہ مکرّمہ، ہجرت کر گئے۔

مدرسہ دیو بند ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا۔

جس کے قیام سے آپ، آٹھ سال پہلے، ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔

لیکن، ایک عرب مؤرخ لکھتا ہے کہ:

مولانا رحمتُ اللہ، کیرانوی، دارالعلوم دیو بند کے فاضل اور وہاں کے فارغُ التحصیل تھے۔

یعنی، جس ادارے کے قیام سے، آٹھ سال پہلے، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی ہندوستان چھوڑ چکے تھے، اُس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ دارالعلوم دیو بند کے فارغ ہیں۔

فرضی تاریخ نویسی کے پروپگنڈہ اور اس کے دھوکے میں ہی آکر

عرب مؤرخ نے، مذکورہ بات لکھی ہے۔

یہ مولانا رحمت اللہ، کیرانوی، وہ تھے کہ:

جب، مصنفِ براہینِ قاطعہ، مولانا خلیل احمد، انبیٹھوی سہارن پوری اور حضرت مولانا غلام دستگیر، قصوری کے درمیان ۱۳۰۶ھ میں بھاولپور، پنجاب کے اندر، مناظرہ ہوا اور اس کی روداد ''تَقْدِیسُ الْوَکِیل عَنْ تَوْهِینِ الرَّشِید وَ الْخَلِیل'' کے نام سے شائع ہوئی

تو، طبعِ دوم (۱۳۰۷ھ) کے اندر، مولانا رحمت اللہ، کیرانوی کی تحریری تصدیق، موجود ہے۔

آپ حضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔

اس کا خلاصہ، یہ ہے کہ ''**میں، مولوی رشید احمد کو، رشید، سمجھتا تھا۔**

مگر، میرے گمان کے خلاف، یہ کچھ اور ہی نکلے۔''

تو، ایسے سنّی عالم (مولانا کیرانوی) کو بھی اپنا عالم کہنے، اور دارالعلوم دیو بند کا فارغ بتانے میں، ذرا بھی دریغ اور ذرا بھی تکلف اور جھجھک محسوس نہیں کرتے کچھ لوگ۔

اس طرح سے پوری تاریخ کو کھنگالنے کی، پوری تاریخ کو جانچنے کی

پوری تاریخ کو صحیح طور پر، پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

محترم اساتذہ وطلبہ! تاریخی حقیقت کا ایک، ناقابلِ تردید پہلو، یہ ہے کہ:

رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن اور کلکتہ سے، بالترتیب ۱۸۲۵ء اور ۱۸۳۸ء میں انگریزی اور اردو میں چھپنے والی کتاب **تقویۃ الایمان از شاہ اسمٰعیل دہلوی کے**

وہابی مسلک ونظریہ سے وابستہ عُلما کا، مجموعی طور سے

جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے، دور دور تک، کوئی تعلق، نظر نہیں آتا۔

یہ بات، سرسید نے اپنی کتاب ''**اسبابِ بغاوتِ ہند**'' مطبوعہ ۱۸۵۸ء میں صراحت کے ساتھ، تحریر کی ہے۔

اسی طرح، مقالاتِ سرسید، حصہ نہم کے حاشیہ میں صاف صاف لکھا ہوا ہے کہ:

انگریز کے خلاف، جنگ میں حصہ لینے والے، وہ سب کے سب، عُلمائے کرام، شامل تھے جو سید احمد، رائے بریلوی و شاہ اسمٰعیل، دہلوی کے شدید ترین مسلکی مخالف تھے۔

آزادیٔ ہند ۱۹۴۷ء کے بعد لکھی گئی کتاب ''عُلمائے ہند کا شاندار ماضی'' حصہ چہارم میں جمعیۃ العُلمائی مؤرخ، مولانا سید محمد میاں، دیوبندی نے لکھا ہے کہ:

عُلمائے صادق پور، پٹنہ، تنظیمی طور پر، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء سے بالکل الگ تھلگ رہے۔

اور مولانا عبدالرحیم، صادق پوری کی تحریر کے مطابق، یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے مخالف تھے۔

مجاہدِ آزادی، حضرت مولانا سید کفایت علی، کافیؔ، مرادآبادی کو، حضرت امام احمد رضا، قادری برکاتی، بریلوی، نے، اپنے اس شعر میں ''**سلطانِ نعت گویاں**'' فرمایا ہے:

کافیؔ، سلطانِ نعت گویاں ہیں رضاؔ۔ اِنْ شَاءَ اللّٰہ، مَیں، وزیرِ اعظم

عزیز طلبہ! آپ، اَبنائے اشرفیہ ہیں۔ آپ کو، کام کرنا ہے۔

مجھے، یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ، حافظِ ملّت (حضرت مولانا عبدالعزیز، محدّث مرادآبادی مبارک پوری) عَلَیْهِ الرَّحْمَه کے درِ دولت پر (جہاں، اب، عزیزِ ملّت، مولانا عبدالحفیظ عزیزی سربراہِ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، قیام پذیر ہیں) حاضر ہوا۔

مَیں نے، جماعتی حالات سے متعلق، کچھ باتیں کرتے ہوئے عرض کیا کہ:

حضرت! ہمارے یہاں، فلاں کام کی طرف، زیادہ توجہ، نہیں ہے۔

یہ کام نہیں ہورہا ہے۔فلاں کام ہونا چاہیے۔وغیرہ وغیرہ۔

تو،اُس وقت آپ نے ارشادفرمایا کہ:''اِنْ شاءَ اللّٰہ کام ہوگا اور یہیں سے ہوگا''۔

حافظِ مِلَّت عَلَیْہِ الرَّحْمَہ نے،جوخواب دیکھا ہے،اُس کو آپ،شرمندۂ تعبیر کریں۔

اور پوری مِلَّتِ اسلامیہ کی قیادت،سیادت،اوراس کی رہنمائی کا
جو عظیم الشان فریضہ ہے،اسے،انجام دیں۔
کیوں کہ پورے ملک کی نگاہیں،ہماری طرف،آپ کی طرف،لگی ہوئی ہیں۔

پورے ملک کی ہی نہیں،بلکہ ملک سے باہر کی بھی نگاہیں،ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ:

اشرفیہ،ہماری جماعت کا عظیم الشان مرکزی ادارہ ہے۔اوراشرفیہ،ہماری جماعت کا ایک مرکزی نہیں،بلکہ اگر تعمیری اعتبار سے،اس کی تعبیر کی جائے تو:

اشرفیہ،ہمارے شہرِ اہلِ سُنَّت کا **تاج محل** ہے۔ہمارا حُسن ہے۔ہمارا وقار ہے۔ہماری عظمت ہے۔اوراس سے،ہماری شان وشوکت،وابستہ ہے۔

اِس طرح،پوری دنیاے اہلِ سُنَّت کی نگاہیں،ہماری طرف لگی ہوئی ہیں کہ:
فرزندانِ اشرفیہ،کام کرتے ہیں اور کام کریں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔اس کا کرم واحسان ہے کہ قوم نے،ہم سے جو توقعات،وابستہ کررکھی ہیں

ایک حدتک،ہم،وہ توقعات،رفتہ رفتہ،پوری بھی کررہے ہیں۔
علمی میدان میں،فکری میدان میں،تحریری میدان میں،صحافتی میدان میں
اِس وقت،اگر،آپ پوری جماعت کا جائزہ لیں
تو ۸۰/۷۰ فیصد تعداد،فرزندانِ اشرفیہ کی نظر آئے گی۔

دلّی کے اندر،جب کبھی،دانشوروں،صحافیوں،لیڈروں،ایڈیٹروں سے میری گفتگو ہوتی ہے۔

عُلماے اہلِ سُنَّت،یامدارسِ اہلِ سُنَّت کا ذکر آتا ہے
تو عموماً،سب سے پہلے وہ اشرفیہ مبارک پور کا نام لیتے ہیں۔
حکومتی حلقوں تک بھی یہ بات اچھی طرح،معلوم اور واضح ہوچکی ہے کہ:
اہلِ سُنَّت کا سب سے بڑا مدرسہ،مبارک پور میں ہے۔

اوراِس وقت کی جوخانقاہی،یابریلوی قیادت ہے،اس کا مسلکی مرکز،بریلی ہے۔

مگر،علمی وفکری اعتبار سے اہلِ سُنَّت کی باگ ڈور،اشرفیہ مبارک پور کے ہاتھ میں ہے۔

تو،یہ تأثر بھی،عام ہو چکا ہے اورمزید توقعات بھی آپ سے وابستہ کی جارہی ہیں۔

آپ حضرات،یہ عزم لے کر،یہاں سے اٹھیں کہ:

یہ توقعات،ہمیں،پوری کرنی ہیں۔قوم کا،ہمیں،قابلِ قدر سرمایہ،بننا ہے۔

قوم نے ہم سے جو توقعات وابستہ کررکھی ہیں،اسکی توقعات سے کہیں آگے بڑھ کر،ہم کو کام کرنا ہے۔

اس کے بعد آپ اورہم،صحیح طور پر،فرزندانِ اشرفیہ کہے جانے کے مستحق ہوں گے۔

اور جو ہمارے سنّی حنفی اسلافِ کرام تھے،انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر
ہم،کامیاب ہوسکتے ہیں۔ہمیں،جو کچھ بھی کرنا ہے اپنے دل ودماغ وفکر اور سوچ کا
جو بھی استعمال کرنا ہے،وہ،استعمال کریں
لیکن،اپنے اکابر واسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے
اوران کے ساتھ،سعادت مندی اور وابستگی کا اظہار کر کے۔کیوں کہ:
اہلِ سُنَّت کا سرمایۂ افتخار ہی ہے،سعادت مندی اور بزرگوں کے ساتھ
عقیدت ومحبت اور احترام کا جذبہ رکھنا۔

اس سے،ذرا بھی،جو شخص،اِنحراف کرتا ہے،پھر،اسے،بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔

وہ بہک جاتا ہے۔بے توفیق اور بے فیض ہوجاتا ہے۔
اس لئے اپنے اساتذہ سے،اپنے مشائخ سے،اپنے اسلافِ کرام سے
وابستہ رہ کر کے ہی،ہم کو،سارا کام کرنا ہے۔
اس سے ایک اِنچ بھی الگ ہٹ کر،ہمیں،کوئی ایسا کام،نہیں کرنا ہے

جو ہمارے موقف،ہمارے مسلک کے لئے باعثِ رسوائی اور باعثِ خسارہ،ثابت ہو۔

اس بات کو،آپ سبھی حضرات،اچھی طرح،ذہن نشین کرلیں۔
اب،بات،بہت ہوچکی ہے۔آیندہ پھر کبھی موقع ملے گا
تو اِنْ شاءَ اللّٰہ،مزید کچھ باتیں،عرض کروں گا۔

وَ آخِرُ دَعوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔اَلسَّلامُ عَلَیْکُم وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکاتُہٗ۔

(مطبوعہ ماہنامہ،**کنزالایمان**،دہلی۔شمارہ جون ۲۰۰۷ء)